

اسلامی نظام: سیاسی ذرائع سے قیام ممکن ہے؟

ڈاکٹر انیس احمد

نوجوان نسل کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتی ہے۔ اگر نوجوانوں میں عزم، خود اعتمادی، اللہ پر انحصار، صبر، پُر امیدی، محنت کشی اور منزل کا شعور پایا جائے تو وہ قوم مشکل ترین حالات سے بآسانی نکل کر ترقی کے کٹھن مراحل کو بہولت طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اگر کسی قوم کے نوجوانوں میں بے روزگاری، عدم تحفظ، نفیاتی دہشت گردی اور مستقبل کے تاریک ہونے کا احساس بٹھادیا جائے اور ابلاغ عاملہ خصوصاً یہ کوشش کرے کہ ملک میں ہونے والی ہر مردمانی کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے کہ گویا ملک میں نہ کوئی لظم ہے، نہ تحفظ، نہ ترقی کی صلاحیت تو وہی نوجوان جو قوم کا اناشاد اور مستقبل کے معمار ہوتے ہیں اس نفیاتی حریبے کا شکار ہو کر عموماً تین راستوں پر چل پڑتے ہیں۔

تبديلی کی راہیں اور حکمت عملی

پہلا راستہ فرار کا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملک کے باہر جہاں کہیں خوابوں کی جنت کی خوبیوں سونگھے سکتے ہوں وہاں قرض رقم لے کر ایسے اداروں اور افراد کے ذریعے جو بیرون ملک روزگار کا ٹھیک لیتے ہیں، ملک سے فرار ہو جائیں یا حکومتی اسکالر شپ پر جا کر ملک کے باہر ہی بیٹھ جائیں اور واپس نہ آئیں۔

دوسرہ راستہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر زمینی حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے زبان سے حالات کا ماتم لیکن زمانے کی ہوا کے ساتھ اپنے آپ کو اڑانے کی کوشش، چنانچہ وہ سول سروں کے ذریعے ملازمت کا حصول ہو یا کسی سفارش اور جعلی ڈگری کے ذریعے صوبائی یا مرکزی پارلیمنٹ میں ممبر شپ یا کسی زمین کے مافیا کے ساتھ شامل ہو کر عوام کو لوٹنا، غرض کرپشن اور مادہ پرستی کے چنگل میں

پھنس کرو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے وہ جو کل تک ویکنوں میں سفر کرتے تھے، دھوکے سے حاصل کی ہوئی دولت کے سہارے بڑی بڑی گاڑیوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔

تیسرا سستہ جو نوجوان اختیار کرتے ہیں وہ موجودہ نظام کو چاہے وہ مصر میں ہو یا پاکستان میں، شام میں ہو یا تیونس میں، وہ اس فرسودہ، مادہ پرست اور ظلم پر منی نظام کو، طاغوت، کفر اور شرک سے تشویہ دیتے ہوئے قوت کے استعمال سے اس کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ راتوں رات اداروں پر قبضہ کر کے ملک میں شریعت، اسلامی حکومت، معروف، بھلائی اور عدل کے نظام کو قائم کر دیا جائے۔ یہ راستہ دیکھنے میں بہت کم مسافت کا نظر آتا ہے اور پھر اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قوت کے ذریعے، مناسب مصوبہ بنندی کے بعد بھی اگر وہ تبدیلی لانے میں کامیاب نہ ہوں تو چونکہ جہاد کرنے والے کے لیے ہر دشکوں میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے تو یہ نوجوان اپنی جان کو اس راستے میں قربان کرنے ہی میں اپنی فلاح سمجھتے ہیں۔

اگر تینوں راستوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تیسرا راستے والے بظاہر ہر لحاظ سے کامیاب نظر آتے ہیں کہ اگر دنیا میں کامیاب ہوئے تو کم عرصے میں کام کرنے کے باوجود تبدیلی لے آئیں گے اور اگر کامیاب نہ ہوئے جب بھی آخرت تو بن گئی۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے ماضی کے تمام گناہ، غلطیاں، بے راہ روی ہر ہر بُرائی معاف ہو جائے اور شہادت کے حصول کے بعد وہ سیدھا جنت میں جائے، جہاں اللہ کی ساری نعمتیں اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔

ایک بات جو ان تینوں راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے وقت غور کرنے اور خلوصِ نیت کے ساتھ اپنے آپ کو تمام تصورات سے آزاد کر کے سوچنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت جن کے نفاذ اور قیام کے لیے یہ ساری جدوجہد کی جاتی ہے وہ خود کس راستے کی طرف بلاتے ہیں۔ کیا وہ دنیا طلبی، مفاہمت، وقت پرستی یا پھر بس شہادت کے حصول اور طلب کو مقصد حیات قرار دیتے ہیں یا شہادت حق کے فریضے کی ادائیگی کے لیے انہیاً کے کرام کے اسوہ اور خصوصاً خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

کسی بھی مسلمان کے لیے وہ جوش اور ولے سے بھرا ہوا نوجوان ہو یا سکون و ٹھیڑاؤ کے ساتھ سوچنے والا معمُر شخص، جوبات فیصلہ کن ہے وہ اس کا اپنے ذہن سے ایک تصور قائم کر لینا نہیں ہے بلکہ قرآن اور سنت رسول اللہ کی سند اور دلیل کی بنیاد پر اپنے لیے لائج عمل طے کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات اس تعمیری عمل میں ایک سے زائد لائج عمل ایسے ہو سکتے ہیں جو قرآن و سنت سے مطابقت رکھتے ہوں۔ ایسی شکل میں سنت کا اصول سیدہ عائشہؓ کی روایت کی روشنی میں وہ ہے جو زیادہ یسرپرمنی ہو اور جس کی دلیل سنت رسولؐ میں پائی جاتی ہو۔

گویا راستے کا تعین، حکمت عملی کا انتخاب اور تبدیلی کا طریقہ طے کرتے وقت منزلِ محض حصول شہادت نہیں ہو سکتی بلکہ حق کی شہادت دینے کے لیے وہ تمام ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جو سنتِ نبویؐ سے ثابت ہوں اور جو آخراً خرکار شہادت تک لے جانے والے ہوں۔

انبیاء کرامؐ کی حکمت عملی

انبیاء کرامؐ کی بنیادی دعوت حضرت آدمؐ سے لے کر خاتم النبیینؐ تک صرف یہی رہی ہے کہ تمام انسان اپنے خالق، مالک اور رب کی بندگی میں آ جائیں اور اللہ جل جلالہ کے سواتمام بندگیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر کے اس کے عبد یا تابع دار بن جائیں۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ
(النحل ۳۶:۱۶) ہم نے ہر امت میں ایک رسولؐ بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی اختیار کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

عبدیت قرآنؐ کریم کی ایک جامع اور اہم اصطلاح ہے جس میں نہ صرف نماز اور دیگر عبادات بلکہ زندگی کے تمام ممکنہ معاملات میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو حاکم، مالک، آقا اور فیصلہ کرنے والا تسلیم کیا جانا شامل ہے۔ ایک مسلمان اسلام لانے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حجؐ کی حد تک تو اللہ ہی کی عبادت یا بندگی اختیار کروں گا لیکن میرے سیاسی معاملات لا دینی جمہوریت کے اصول طے کریں گے اور معاشری معاملات کو سرمایہ دارانہ معیشت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا اور معاشرتی، ثقافتی معاملات میں فلاں علاقہ یا ملک کے کچھ اور روایات پر عمل کروں گا۔ اسلام میں داخل ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک فرد اسلام میں پورے کا پورا داخل ہو۔

اَدْخُلُوْفِي السِّلْمِ كَآفَّةً لَا تَبْغُوا خُطُوْتَ الشَّيْطَنِ (البقرہ ۲۰۸:۲) ”اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔“

آیت مبارکہ بلا کسی ابہام کے یہ بات واضح کرتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتا۔ وہ یہ نہیں کر سکتا کہ جمعہ کے دن وہ اللہ کا بندہ ہو، جب کہ تجارتی معاملات میں سرمایہ دارانہ نظام کا تابع ہو اور سیاسی معاملات میں مفاد پرست، لا دینی سیاسی نظام پر ایمان لے آئے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو وحدۃ الاشیریک ماننے کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے تمام ذاتی، گھریلو، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی معاملات میں ایک فرد اور جماعت صرف اور صرف اللہ کی حکیمت پر ایمان رکھے اور اس کا عمل اس کی شہادت پیش کرے۔

کلمہ شہادت کا مطلب ہی یہ ہے ایک شخص اللہ اور اس کے رسول کو اپنے تمام معاملات میں حاکم اور شارع مان کر اسلام میں داخل ہو رہا ہے۔ عقیدہ اور ایمان، اسلام کی نگاہ میں ایک خفیہ اور ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک عوامی شہادت (public testimony) ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ اور عمل سے صرف اللہ کی بندگی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر راضی ہو گیا ہے۔

بعض سادہ لوح افراد اسلام میں داخل ہونے اور اسلام کے نفاذ کے عمل کو دو مرحلوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، جب کہ یہ ایک ہی مرحلے سے تعلق رکھنے والا عمل ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ پہلے لا الہ کا عمل ہو گا اس کے بعد الا اللہ کا۔ ہمارے علم میں نہ قرآن میں اور نہ سنت مطہرہ میں کوئی ایسی شہادت ہے، جو اس تعبیر کی قدر لیت کرتی ہو۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ ہو یا مدینہ منورہ، جہاں کہیں بھی کسی نے دعوت اسلام کو قبول کیا تو اسلام میں پورے داخل ہونے کے ساتھ ہی کیا۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ پہلے مرحلے میں صرف کفر و شرک کا رد کیا جائے اور پھر کسی دوسرے مرحلے میں اللہ کی بندگی اختیار کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کو رب اور مالک ماننے کا مطلب بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ سب کا انکار کیا جائے، لا الہ اور الا اللہ ایک ہی عہد اور میثاق کا حصہ ہیں، اس لیے شہادت کو دو مرحلے میں تقسیم کرنا ایک غیر ضروری بحث ہے۔ اللہ کی بندگی کی ثبت دعوت خود بخود تمام منقی تصورات کو جز بندیاد سے اکھاڑ کر انسان کے دل و دماغ اور عمل کو توحید کے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ مکہ کے دور ابتدیا میں دعوت توحید قبول کرنے والے ہر تنفس کو اس بات کا مکمل شعور تھا کہ

اللہ کو ماننے کا مطلب ہی تمام خود ساختہ خداوں کا رد اور انکار ہے۔ اگر مسئلہ محض مکہ کے اندر مانے جانے والے ۳۶۰ سے زائد خداوں میں ایک اور کے اضافے کا تھا تو اس پر مشرکین مکہ کو نہ کوئی اعتراض تھا، نہ شکایت۔ اگر وہ ۳۶۰ بتوں سے تعلقات بنا کر رکھ سکتے تھے تو اس میں ایک کے اضافے سے انھیں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ اصل مسئلہ یہی تھا کہ ایک اللہ کو ماننے کے بعد وہ ۳۶۰ سے زائد خدا سب کے سب بے اصل اور بے اثر ہو جاتے۔ شرک کا آسان سامطلب یہی ہے کہ اللہ وحدۃ الاشیریک کے ساتھ دوسروں کو اس کی ذات یا صفات میں شامل کر لیا جائے۔ مشرکین میں سے بھی بعض افراد اللہ کو مانتے تھے۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جب یہ مشرکین سمندر میں طوفان میں گھر جاتے ہیں اور انھیں اپنی مضبوط کشی ڈولتی اور ڈوبتی نظر آتی ہے تو وہ اللہ ہی کو پکارتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب سفر پر جانا ہو، جنگ کرنی ہو، اولاد کی خواہش ہو یا بارش کی ضرورت ہو تو وہ اپنے مقرر کردہ خداوں ہی سے رجوع کرتے تھے۔

آج کے جدید دور میں ان خداوں کے نام بدل گئے ہیں۔ کسی کا نام آئی ایم ایف اور ولڈ بنک ہے، جس سے لوگ قرضوں کی الیچا کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ہماری روزی اور روزگار دینے والا خدا یہی ہے۔ بعض کسی نام نہاد عالمی طاقت کو اپنی فرمان برداری کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ انھیں اقتدار پر قابض رہنے میں مدد فراہم کرے گی اور وہ اُس کے سہارے عوام پر حکومت کر سکیں گے۔ بعض اپنے ملکی دفاع کے لیے کسی بڑی عسکری طاقت کے قدموں کو بوسادیتے ہیں کہ وہ انھیں اسلحے کی بھیک دے کر ان کے دفاع کو مضبوط بنانے کا ضامن بن سکے۔ یہ منئے ادارے اور نام ایجاد کرنے کے ساتھ اگر ایک شخص یہ ایمان رکھتا ہو کہ وہ بندہ تو اللہ کا ہے لیکن خادم کسی بیرونی مالی طاقتوں کا یا کسی نام نہاد عسکری قوت کا یا کسی شافتی سامراج کا ہے تو یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کی تعریف میں آئیں گے۔

توحید اسلام کا نقطہ آغاز بھی ہے اور نقطہ کمال بھی۔ یہ ہر معاملے میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک اور آقامانے کے عمل کا نام ہے۔ حضرت نوحؐ سے لے کر خاتم النبیینؐ تک اللہ کے ہر بنیؐ نے صرف ایک دعوت دی کہ اپنے تمام معاملات کو اللہ کے لیے خالص کرو۔ اسلام نے جن بتوں کو پاش پاش کیا ان میں نہ صرف عصیت، قبائلیت، نسلیت، لسانیت کے بت تھے بلکہ وہ

تمام تصورات بھی شامل تھے جنہیں انسانوں نے اپنے ذہن اور قیاس کی بنا پر قائم کر لیا تھا، اسلام ان سب کا رد کرنے کا نام ہے اور دعوت الی الحق کا واضح مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات میں صرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم مان لینا اور اس کی شہادت اپنے عمل سے دینا۔ اسلامی معاشرے اور ریاست کے قیام کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ سیاسی، معاشری، معاشرتی اور ثقافتی و قانونی تمام معاملات کو طاغوت کے نظاموں کے اثر سے مکمل طور پر آزاد کر کے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حاکیمت اعلیٰ کی بنیاد پر اور اس کی رہنمائی کی روشنی میں مرتب اور منظم کیا جائے۔ دورِ جدید کی تمام تحریکات اسلامی کا، وہ جماعت اسلامی پاکستان ہو یا اخوان المسلمون یا جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر یا جماعت اسلامی ہند، ان سب کی دعوت کا بنیادی ستون ہی قیام حاکیمت الہی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان نے قیام پاکستان سے قبل اور اس کے بعد اسی بنیادی دعوت کی طرف اللہ کے بندوں کو بلا یا ہے اور اسلامی ریاست اور معاشرے کے قیام کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں ایک بذریعہ تبدیلی کی حکمت عملی وضع کی ہے۔ اس حکمت عملی میں رہنماءصول انبیاء کرام کا طریق دعوت اور قیام حاکیمت الہی کے لیے ان کی حکمت عملی کی روشنی میں لا تجز عمل کو وضع کرنا شامل ہے۔

مغربی لادینی جمہوریت

جدید تحریکات اسلامی کے مفکرین امام حسن البنا شہید ہوں یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی یا سید قطب شہید یا ڈاکٹر محمد ناصر، ہر صاحب علم نے مغربی لادینی جمہوریت کی فکری بنیادوں کو رد کرتے ہوئے ہی اسلامی ریاست کو بطور تبادل نظام کے پیش کیا اور جو تحریکات ان مفکرین کو اپنارہنمای کہتی ہیں انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس موقف سے اخراج نہیں کیا۔ اس لیے کسی نظری بحث میں اُنھے بغیر ہمیں ان ضمنی سوالات پر غور کرنا ہو گا جن پر بہت سے مغلص، در دمند اور اسلام کی سر بلندی کے لیے جان کی بازی لگانے والے نوجوان مکمل صورت واقعہ کو سامنے نہ رکھنے کے سبب جذبات کی روئیں بہرہ کر یعنیت کے ساتھ نتا ج اخذ کر لیتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے جو جانی چاہیے کہ کیا مغربی لادینی اور ابا حیث پسند جمہوریت اسلامی نظام حکومت کی ضد ہے اور اس کی بنیادیں اسلام کی بنیادوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ بات بھی ہے

ہو جانی چاہیے کہ کیا تحریکاتِ اسلامی نے، بشویں جماعتِ اسلامی پاکستان، کسی موقع پر بھی مغربی لادینی جمہوریت کی تائید کی ہے یا اس کی جگہ نظامِ اسلامی کے قیام کی دعوت اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے سے درفعہ نہیں کیا ہے۔ کیا مصر میں حالیہ واقعات میں ہزارہا افراد کی جانی قربانی، مصر کی طاغونی جمہوریت کے لیے دی گئی یا خالصتاً اللہ کے دین کے قیام کے لیے یہ قربانیاں دی گئیں۔ کیا اسی اخوانِ المسلمون نے جو ایک وقت زیریز میں سرگرمی کو حکمتِ عملی کے طور پر صحیح سمجھتی تھی، گذشتہ ۳ سال کے عرصے میں جمہوری ذرائع سے جدوجہد کو اختیار نہیں کیا اور صنی مبارک کے آمرانہ دور میں مصر کی پارلیمنٹ میں دعویٰ حکمتِ عملی اور سیاستِ شرعیہ کی پیروی کرتے ہوئے شرکت نہیں کی۔ رہایہ سوال کہ وہ تبدیلی جو وہ چاہتے تھے کہاں تک آئی اور کیا فوجی مداخلت کی بنابری کہنا درست ہوگا کہ جمہوری ذرائع ناکام ہو گئے، ایک الگ بحث ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے ہو جانی چاہیے کہ اگر مرض پر انا ہو اور جراحت اس کا تہبا علاج نہ ہو تو ایک ماہر اور مخلص طبیب ہی یہ طے کر سکتا ہے کہ کس ترتیب کے ساتھ کون سی دوائیں دی جائیں تاکہ مرحلہ بہ مرحلہ مریض سخت یا بہتر جائے۔ یہ طے کرنا کہ پھیپھڑے دل یا جگر میں جو خرابی تمام جسم کو فاسد مادوں سے بھر رہی ہے اسے یک دم جراحت کر کے ختم کر دیا جائے یا بتدریج ادویات، غذا، ورزش، آب و ہوا کی تبدیلی، عادات کی تبدیلی اور دیگر ذرائع کا استعمال کر کے مریض کو ایک سخت مندانسان بننے میں مددوی جائے، ایک ماہر طبیب ہی کا کام ہے۔ اس میں بھی شہر نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ہی مریض اور ایک ہی مرض کو اگر دو یا تین ڈاکٹر دیکھیں تو ان کی تشخیص میں فرق ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر تین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ تمام ممکنہ امتحانات اور جائزے کے بعد اس پر متفق ہو کہ مریض کا علاج بغیر جراحت کے ہو سکتا ہے اور ایک ڈاکٹر یہ کہے کہ چونکہ مرض مہلک یا طاغونی نوعیت کا ہے اس لیے پہلے جراحت کرو بعد میں مریض کی قوت برداشت، اور دواؤں کے ذریعے سخت مندی کی طرف لاو تو اس کی رائے اس کے اپنے خیال میں تو درست ہو سکتی ہے لیکن مریض کی جان اور دیگر اطباء کے اجتماعی تجربے کے مقابلے میں کیے گئے فیصلے کے سامنے کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ہاں اس بات کا امکان بہر صورت رہتا ہے کہ کئی ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد مریض

مکمل صحت یا بہوجائے یا ڈاکٹر اپنی رائے تبدیل کر لے۔ اسی طرح بالکل یہ امکان بھی رہتا ہے کہ اگر تھا ایک ڈاکٹر کی رائے پر جراحت کر دی جائے تو جراحت کے دوران ہی مریض انتقال کر جائے۔ اس لیے محض امکانات پر فیصلے نہیں کیے جاسکتے۔ ماضی کی تاریخ، اجتماعی تحریبے اور طلبی حکمت عملی کے پیش نظر ہی دنیا میں صحت کا نظام چل رہا ہے۔

جہاد پر مبنی حکمت عملی

اس روزمرہ کی مثال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ تبدیلی صرف جہاد سے آئے گی کے غرے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ قرآن و سنت نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ جہاد ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے اور اگر کسی خطے میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو اور انہیں مستضعفین فی الارض بنادیا گیا ہو تو ان کی امداد کرنا اہل ایمان پر فرض ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَاءِ وَالْوُلَدِينَ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرِيَّةِ الظَّالِمُونَ أَهْلُهَا وَ اجْعَلُ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَ اجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (النساء: ۲۵:۲)

(ایے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اُن لوگوں کو جو آخرت کے بد لے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبایے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدا یا ہم کو اس بیتی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

اسی طرح فتنہ اور فساد فی الارض کو دور کرنے کے لیے بھی اسلامی ریاست کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ وَقْتُلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَ يَكُونُ الَّذِينَ لِلْقَاتَلِ اَنْتَهُوا فَلَا عُدُوانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۝ (البقرہ: ۱۹۳:۲)

”تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ بازاً جائیں، تو سمجھو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر درست درازی روانہ نہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی تمام زندگی ہی جہاد ہے۔ ظلم کے خلاف، نفس کے خلاف اور طاغوت کے خلاف۔

آیاتِ جہاد پر غور کیا جائے تو دو اصول بالکل واضح ہو کر سامنے آتے ہیں: اولاً کسی بھی ظالم اور طاغوتی نظام میں محض مظلوم بن کر رہنا، اسلامی فکر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ طاغوتی نظام میں دو ہی راستے ہو سکتے ہیں: اولاً: اس کے خلاف جدوجہد کہ اس کی جگہ عدل کا نظام آئے اور اگر تمام تر کوششوں کے بعد صبر و تحمل کے ساتھ تمام دعویٰ مراحل سے گزرنے کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ یہاں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی تو پھر وہاں سے بھرت۔ اس میں اگر عجلت کی گئی تو وہ غلط ہو گا [حضرت یونسؐ کی مثال ہمارے سامنے رہنی چاہیے]۔ یہی شکل مکہ مکرمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے ثابت ہوتی ہے کہ ۱۳ برس تک ہر ہر آزمائش اور تعذیب سے گزرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی حکم دیا تو بھرت کی گئی، ورنہ مکہ میں بذریعہ قوت قریش کی حکمرانی کو ختم کر دینا بھی ایک امکانی اقدام (option) تھا۔ حضرت عمرؓ، حضرت حمزہ اور دیگر صحابہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود مشرکین کے سرداروں کو ایک رات میں قتل کر کے اسلامی نظام قائم کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

قرآن کریم نے جان اور مال کے ساتھ جہاد کو افضل قرار دیا ہے اور بیٹھنے رہنے والوں کے مقابلے میں میدانِ جہاد میں آنے والوں کے لیے اعظم درجے کا وعدہ فرمایا ہے۔ سورہ نساء میں فرمایا گیا: لَا يَسْتَوِي الْفَعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولَى الضرَرِ وَالْمُجْهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَأْمُوَالِهِمْ وَ انْفُسِهِمْ فَضَلَّ اللّٰهُ الْمُجْهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَ انْفُسِهِمْ عَلَى الْقَعِيدِينَ دَرَجَةً وَ كُلًا وَ عَدَ اللّٰهُ الْحُسْنَى وَ فَضَلَّ اللّٰهُ الْمُجْهِدِينَ عَلَى الْقَعِيدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (النساء ۹۵:۳)

”مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معدوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے، ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

سو، فاسد میں اس بات کو دوڑوک انداز میں واضح کر دیا گیا۔ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معدوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں،

دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ اعظم و افضل رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ بر امداد کرنے والا، رحم فرمائے والا ہے۔

جہاد قرآن کریم میں ایک جامع اصطلاح ہے جس میں افضل ترین شکل وہ نہیں ہے جو بعض حضرات ایک ضعیف حدیث کی بنابر سمجھتے ہیں بلکہ میدان عمل میں طاغوتی قوتوں کے خلاف مناسب حکمت عملی اور تیاری کے ساتھ جہاد کرنا قرآن کریم کا مقصود ہے۔ اس جہاد کے بارے میں یہ بات بھی سمجھاوی گئی ہے کہ اگر اہل ایمان طاغوتی قوتوں سے عددي لحاظ سے کم بھی ہوں تو وہ اپنے خلوص، اللہ پر اعتماد، صبر اور حکمت عملی کے صحیح ہونے کے سب کامیاب ہوں گے، چاہے ان کا تناسب ایک اور دس کا ہی کیوں نہ ہو، یعنی اہل ایمان ۲۰ ہوں اور طاغوتی قوت ۲۰۰ کے لگ بھگ ہو۔

يَأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضُ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَبِّرُوْنَ يَعْلَمُوْا مِائَتَيْنِ وَ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةً يَعْلَمُوْا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا يَأْنَهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ (انفال: ۲۵) ”اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے ۲۰ آدمی صابر ہوں تو وہ ۲۰۰ پر غالب آئیں گے اور اگر ۱۰۰ آدمی ایسے ہوں تو متنکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھنیں رکھتے۔“

اسی چیز کو اہل ایمان نے بدر میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جب أحد اور حنین میں حکمت عملی پر صحیح عمل نہ کیا تو دوسری نوعیت کے نتائج سامنے آ کر رہے۔ مکہ مکرمہ میں ۱۳ بر س کا عرصہ بھی عرصہ جہاد تھا کہ ہر ہر سطح پر مراجحت کا سامنا تھا۔ تعذیب تھی، امتحان تھا، ظلم تھا لیکن یہاں جہاد کی ایک خاص شکل تھی اور مدنی دور میں حالات کی تبدیلی کے بعد اس کی دوسری شکلیں سامنے آئیں گی، لہذا یہی جہاد مدینہ منورہ میں معاشرے کی تعمیر، عدل کے نظام کے قیام اور اہل کتاب کے ساتھ تعلقات کی نوعیت طے کرنے میں میثاق مدینہ کی شکل اختیار کر گیا اور پھر بدر، أحد، خندق، حدیبیہ، چوبک، فتح مکہ، حنین اور خیبر سب ہی جہاد کے مختلف رُخ ہیں۔ گویا جہاد اہل ایمان کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن جہاد ہی ہے، جو امت مسلمہ کے جسم کو زندہ اور متحرک رکھتا ہے۔

جہاد فرض بونے کا سوال

جہاد کے میدان کا تعین کہاں پر کیا جائے، اور کیا کیا جائے، نیز جہاد کے وقت کا تعین کہ کس مرحلے میں کون سی شکل اختیار کی جائے، جہاد کے ہدف کا تعین کہ اصل مطلوب کیا ہے۔ ان تمام معاملات میں فیصلہ کن حیثیت محسن انسانی عقل کی نہیں ہے بلکہ انسانی عقل کو اسوہ نبیؐ کی روشنی میں دیکھنا ہوگا کہ کس صورتِ حال میں شارعِ اعظم نے کیا حکمت عملی اختیار فرمائی۔ مکہ سے ہجرت جہاد کی ایک شکل تھی اور پھر مدنی دور کے تمام ہی سال جہاد کے مختلف مراحل کی تیاری اور ان کی انجام دہی کے سال ہیں۔ فتح مکہ جہاد کی ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی کہ خون بھائے بغیر اللہ کی حاکمیت کو قائم کیا گیا، لیکن یہ بھی اس کا ایک پہلو ہے کہ جن پر حق کی قوتون نے غلبہ حاصل کیا ہے، ان سے کیسے معاملہ کیا جائے، یعنی یہ طے کرنا کہ مکہ میں کن مشرکین کو قتل کرنا ہے اور کن کوان کی ساری زیادتوں کے باوجود معافی دے کر ان کے دلوں کو فتح کر لینا ہے۔ یہ سب کچھ اسوہ حسنہ ہی تو ہے، جس پر غور کیے بغیر جہاد کا مقام، جہاد کا وقت اور جہاد کی حکمت عملی طنہیں ہو سکتی۔ حدیبیہ کے موقع پر جانوں کی قربانی کرنے کا عہد جہاد ہی تھا لیکن اس کے باوجود بظاہر دشمن کے حق میں ہونے والی شرائط پر معاہدہ کرنا بھی جہاد کی حکمت عملی تھا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ شارعِ اعظم کی نگاہ جن نتائج کو دیکھ رہی تھی ان تک فاروقِ اعظم تک کی نگاہ اس خاص لمحے نہ پہنچ سکی۔ نہ یہ ان کے ایمان کی کمزوری تھی نہ فراست میں کی۔ اصل چیز منبعِ نبوت کی اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ، تعلیم اور تعین تھی اور اس منبع میں یہ تمام پہلوؤں قفرح کی طرح ہمیشہ کے لیے موجود ہیں اور ہیں گے۔

جہاد کے حوالے سے ایک اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس کا اعلان کون اور کب کرے گا؟ امام ابن تیمیہ اور دیگر علماء کرام کا اس پر اجماع ہے کہ چونکہ یہ ایک اسرارے طیب حکمت معاہله ہے کہ اس میں امت مسلمہ کی جان اور مال دونوں کا داخل ہے اس لیے یہ فیصلہ ذمہ داری اور عاقبت پر غور کے بعد کیا جائے گا۔ اور یہ مسلمان حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرے۔ استثنائی شکل میں یہ کام ان علماء کا ہے جو کسی سیاسی یا معاشری مفاد کے زیر اثر یہ کام نہ کریں بلکہ امت مسلمہ کے مفاد اور مصلحت عامہ کے اصول پر غیر جذباتی طور پر غور کرنے کے بعد کریں

جیسا کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور حضرت سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید نے تحریک مجاہدین کا آغاز کیا۔

لیکن کسی مسلم ریاست کے خلاف خروج اور خود مسلمانوں کے خون کو حلال کر لینا اس سے بہت مختلف معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ مجھن اس قیاس پر نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ حکومت کے فال اذمہ دار نے کسی پیرومنی قوت سے ایک understanding یا ایک خفیہ معاهدہ کر لیا ہے، اس لیے اس سے وابستہ کسی بھی فرد کو جہاں کہیں چاہیں ہلاک کر دیں۔ اس کی گنجائش دین اسلام میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں مثال خوارج کی ہے۔

خوارج کی فکری غلطی

خوارج نے اپنی فکری غلطی کی بنابر یہ سمجھ لیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ نے بجائے براہ راست قرآن کو حکم بنانے کے دونہ میاندوں کے سپرد یہ کام کر دیا کہ وہ قرآن کی روشنی میں طے کریں کہ مسئلے کا حل کیا ہو۔ اس لیے یہ دونوں حضرات خوارج کی نگاہ میں کفر اور شرک کے مرتكب ہو گئے۔ چنانچہ ان کا خون ان کے لیے حلان ہو گیا۔ اس بنابر خوارج نے یہ طے کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو جہاں کہیں وہ پائے جائیں قتل کیا جائے اور ان کے ساتھ جو لوگ شامل ہوں وہ بھی قتل ہوں۔ امت مسلمہ کی تاریخ گواہ ہے کہ خوارج کی اس فکر کو اجتماعی طور پر رد کیا گیا اور انھیں ایک گمراہ فرقہ قرار دیا گیا۔ گو، ان میں سے بہت سے افراد وہ تھے جو دن میں حضرت علیؓ کے خلاف جنگ کرتے تھے، راتوں کو تجدی اور قرآن سے رشتہ جوڑتے تھے۔ ان کے چہروں پر محرا میں تھیں اور وہ قرآن کے حافظ تھے۔ فکری غلطی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص غیر مختص اور دھوکے باز ہو۔ انتہائی خلوص نیت کے ساتھ اور دین کا جامع تصور نہ ہونے کے سبب اللہ کا ایک بندہ فکری غلطی کا مرتكب ہو سکتا ہے۔

جو چیز دیکھنے اور سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی جان کے دشمن افراد کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کی اور کیا آپ کا یہ کرنا اسلام تھا یا اسلام سے اخراج! آپؐ نے حکم دیا کہ اگر وہ جملہ کریں تو جواب دیا جائے گا کہ جان کا تحفظ کرنا دین کا اصول ہے، لیکن ان کا پیچھا نہ کیا جائے، نہ انھیں غلام بنایا جائے نہ ان کی املاک پر قبضہ کیا جائے، جب کہ وہ کھلی بغاوت کے مرتكب تھے۔

دین کسی ایک پہلو کا نام نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر ہر پہلو کو سمجھ کر حکمت عملی وضع کرنے کا نام ہے۔ جس طرح خوارج نے یہ فیصلہ کر لیا کہ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؑ اور حضرت عمر و بن عاصؓ کو فیصلہ کرنے پر مأمور کرنا شرک اور کفر تھا، قرآن کے حکم ماننے کا انکار تھا، ایسے ہی بہت سے سادہ لوح افراد دین کے نام پر خلوص نیت کے ساتھ یہ عاجلانہ فیصلہ کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کسی نے نام نہاد طاغوت کے کسی نمائیدے سے بات کر لی، مصافحہ کر لیا، کسی ایسے اجتماع میں یا کانفرنس میں شرکت کر لی جس میں طاغوتی نمائیدے موجود ہوں تو وہ شرک اور کفر کا مرکب ہو گیا، اس لیے واجب القتل ہوا۔ اس قسم کی منطق اختیار کرنے سے قبل دین اسلام کے مقصد و مدعایا، نبی کریمؐ کے اسوہ اور حکمت عملی کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں ذمہ دارانہ اور اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس کے ساتھ حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ فیصلے جذباتی انداز میں نہیں کیے جاسکتے۔

خوارج اور اس طرح کے افراد نے جو شکل اختیار کی، امت کی تاریخ نے اس پر کیا فیصلہ دیا، یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ امت نے جس چیز کو اسوہ نبویؐ کے مطابق سمجھا وہ خوارج کی فکر نہ تھی بلکہ بتدریج، مرحلہ بہ مرحلہ، صبر و استقامت اور قربانی کے ساتھ دعوتی کام کرتے رہنا، وقت کے لحاظ سے موجود ذرائع کا استعمال کرنا اور وقت کی قید سے بے پرواہ کر کر اپنی تمام قوت اللہ کے دین کے قیام کے لیے لگادینے ہی کو سواء اس بیل قرار دیا۔

یہ بات بھی سامنے رانی چاہیے کہ دین میں شرعی احکام کا نفاذ صرف اور صرف ظاہر پر ہے باطن پر نہیں۔ یہی سبب ہے کہ مدینہ منورہ میں منافقین کی کھلی اور چھپی ہوئی سرگرمیوں کے باوجود نبی کریمؐ نے منافقین کے قتل کا حکم نہیں دیا، جب کہ وہ اہل کمہ کے ساتھ خفیہ سازشوں میں شریک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت مطہرہ نے انسانی جان کی حرمت کو جو مقام دیا ہے ہم اُس سے بہت دور نکل چکے ہیں۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ نبی کریمؐ کو بہت عزیز تھے لیکن جب حضرت اسامہ نے ایک شخص کو دورانِ جنگ یہ کہنے کے باوجود کہ وہ ایمان لاتا ہے قتل کر دیا تو نبی رحمتؐ نے اس پر سخت غصتے کا اظہار فرمایا اور اسامہ سے پوچھا کہ کیا انہوں نے اس کے دل کو چیر کر دیکھا تھا کہ اس میں ایمان تھا یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ دل سے مسلمان ہوا تھا یا دکھانے اور جان بچانے کے لیے! اس لیے کسی کی تکفیر کر دینا اور مشرک قرار دے کر اس کے خون کو حلال کر لینا نہ

قرآن سے ثابت ہے اور نہ سنت سے۔ خوارج کا بھی عجیب معاملہ تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو تو وہ قتل کے لائق سمجھتے تھے لیکن ذمیوں پر جو غیر مسلم تھے، اس بنا پر کہ ان کی جان کا ذمہ اللہ اور رسولؐ نے لیا تھا، ہاتھ اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ فہم کی غلطی انسان کو کہاں تک پہنچادیتی ہے کہ وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتا ہے اور اس پر نازار بھی ہوتا ہے کہ اصل اسلام پر وہ عمل کر رہا ہے۔ خوارج خلوص نیت سے یقین رکھتے تھے کہ وہ حق پر ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا یہ تجدیگزار اور قرآن کے حافظ تھے اس کے باوجود فکر کی غلطی نے انھیں گمراہ کر دیا۔

اسلامی نظام حکومت میں دستور اور قانون کی تدوین کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ قرآن و سنت کو دستور مان لینے کے بعد نہ کسی مزید دستور کی ضرورت ہے نہ کسی قانون کی۔ اسلام کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ قرآن و سنت کا دوسرا نام شریعت ہے اور شریعت نے جو حدود متعین کر دی ہیں انھیں دنیا کے تمام مسلمان مل کر بھی تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن جن معاملات کے بارے میں قرآن و سنت میں واضح ہدایت موجود نہ ہو، ان کا کیا کیا جائے۔ ظاہر ہے کوئی نتی وجی تو آنہیں سکتی۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ فلاں معاملے میں اس پر یہ وجی آئی ہے۔ جو ایسا کرے گا وہ اللہ اور رسولؐ اللہ پر جھوٹ باندھے گا۔

اختلاف رائے اور اجتہاد

اس کا حل خود قرآن کریم اور سنت رسولؐ نے یہ بتایا کہ ایسے تمام معاملات میں اجتہاد، قیاس اور اجماع پر عمل کیا جائے گا لیکن اس پرے عمل میں اسلامی نظام حکومت کی اصل روح مشاہدات کا کرنا ہے، حتیٰ کہ دور نبویؓ میں بھی بہت سے اہم معاملات مشاورت کے بعد طے کیے گئے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ نبی کریمؐ اپنی فراست اور وجی الہی کے جاری رہنے کی بنا پر اگر چاہتے تو بغیر کسی سے پوچھئے فیصلے فرماسکتے تھے اور آپؐ کا ہر فیصلہ صحابہؓ کے لیے قابل قبول ہوتا لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا تاکہ آپؐ کی امت اسلامی نظم مملکت کے اس اصول کو عمل ادا کیے کہ اس کی اہمیت سے آگاہ ہو سکے۔ غزوہ بدر میں میدان کے انتخاب کا معاملہ ہو یا أحد کے موقع پر مدینہ منورہ میں ٹھیکر مقابلہ یا باہر نکل کر مقابلہ، غزوہ احزاب میں دفاعی حکمت عملی ہو یا احزاب کے بعد یہود کے ساتھ طرزِ عمل کا سوال، ہر اہم معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ کو نہ صرف قائم کیا بلکہ اس

کی رائے کا پورا احترام فرمایا۔

آپ کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے معاملے میں اور اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کی روائی کے سلسلے میں جو فیصلے کیے، انھیں معلومات نہ ہونے کی بنا پر بعض حضرات ان کا veto کرنا کہتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ پہلے معاملے میں حضرت ابو بکرؓ کے پاس دلیل اپنی رائے کی نہیں تھی بلکہ قرآن میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی یہ کس مرکزیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صحیح احادیث کی تھی جن کے واضح الفاظ کی پیروی میں انھوں نے یہ اقدام کیا۔ چنانچہ آپ نے نبی کریمؐ کا ارشاد سنایا کہ: ”مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ جب وہ اقرار کر لیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال میری طرف سے محفوظ ہو جائیں گے، مگر اس کلمہ کے کسی حق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسبہ اللہ کے ذمے ہے۔“ دوسری حدیث جو آپ نے بیان فرمائی اس کے الفاظ بھی بہت اہم ہیں: ”مجھے حکم ملا ہے کہ میں تین چیزوں پر لوگوں سے جنگ کروں: کلمہ لا الہ الا اللہ کی شہادت پر، نماز قائم کرنے پر اور زکوٰۃ کی ادائیگی پر۔“

ان احادیث کے دلیل قطعی ہونے کی بنیاد پر حضرت ابو بکرؓ کا فیصلہ کرنا دلیل شرعی اور واضح نص پر تھا۔ یہاں معاملہ شوریٰ کے دائرے سے باہر تھا۔ قرآن و سنت کے نصوص کی موجودگی میں خلیفہ کا مام صرف ان احکام کا نفاذ تھا۔ مشاورت کس بات پر کی جاتی؟

اسی طرح جس لشکر کو تیار کروانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے علم حوالے کیا ہو، کیا اسے روکنا رسول اللہ کی اطاعت تھی یا اسے آپ کی مشاکل کے مطابق روانہ کرنا ادا یگی فرض تھا۔ یہاں بھی معاملہ نہ شوریٰ کا تھانہ اکثریت یا اقلیت کا۔

یہ خیال کہ خلیفہ صرف اللہ کو جواب دہے ہے قرآن و سنت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شوریٰ اور مشاورت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد ان کے خلاف اپنے تمام امور میں مشاورت کریں اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد جس رائے پر اکثریت کا اتفاق ہوا سے نافذ کیا جائے۔ شوریٰ کا مقصد محض نمائشی طور پر تفنن طبع کے لیے لوگوں کی رائے معلوم کرنا نہیں ہے کہ تمام بحث و مباحثے کے بعد کرے وہی جو خلیفہ خود چاہتا ہو۔ (جاری)